https://telegram.me/ilmokitab

سیّد سبط حسن (ایسا کہاں سے لائیں)

سید سبط حسن کی زندگی اوران کا سفر آخرت کسی اساطیری داستان کا حصہ معلوم ہوتا ہے پچاس برس قبل ایک نوجوان اپنا گھر، زمین جاگیر، بیوی اور تین برس کی بچی کو چھوڑ کر اس دنیا کو بہتر بنانے کے مشن پر روانہ ہوتا ہے اور تقریباً پچاس برس بعد اسی مشن کی تکمیل کے سلسلے میں کراچی سے لکھنؤ کا سفر کرتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کی تقریبات میں شمولیت کے بعد لکھنؤ سے دہلی پہنچتا ہے۔ دہلی سے کراچی کا ہوائی ٹکٹ گم ہو جانے کی وجہ سے واپس نہیں آ سکتا اور وہیں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک سے آج ہزاروں افراد روزانہ باہر جاتے ہیں۔ مگر ان کا سفر مال و دولت بنانے یا سیر و تفریح کے لیے ہوتا ہے۔ سبط، عیش، آرام، مال و دولت سبھی کچھ چھوڑ کر گھر سے نکلے تھے، انھیں تلاش تھی زندگی کے حسن کی، صداقتوں کی، سچائیوں کی، انہی کی تلاش میں انھوں نے سردار جعفری اور مجاز مرحوم کے ساتھ مل کر لکھنؤ سے ترقی پسند ادب کا پہلا مجلّہ شائع کرنا شروع کیا تھا۔ پھر بمبئی جا کر (غالباً 43-1942ء) کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ کے ادارتی عملہ میں شامل ہو گئے۔ وہیں سے اس اخبار کی نمائندگی کے لیے اقوام متحدہ میں متعین ہوئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا جب برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی تحریک پورے عروج پر تھی۔ چنانچہ امریکہ میں سبط حسن نے ملک کی مختلف ریاستوں میں ہندوستان کی تحریک آزادی پر لیکچر بھی دیے۔ وہیں سامراج دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار ہوئے، ان کی گرفتاری کے خلاف اقوام متحدہ میں متعین، دنیا بھر کے اخباری نمائندوں نے اس عالمی ادارے کی کارروائی کا ایک دن کے لیے بائیکاٹ کیا۔ چنانچہ اس دن کی کارروائی کا اخباری ریکارڈ دنیا بھر میں کہیں موجود نہیں ہے۔

1948 میں سبط حسن لاہور آ گئے، ان سے پہلی ملاقات مجھے اب تک یاد ہے خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس ملاقات کے بعد ہم دونوں میں جس دوستی اور رفاقت کی بنیاد پڑی وہ چالیس برس تک قائم رہی۔ اس مدت میں ہم نے زندگی کے بہت نشیب و فراز دیکھے، بہت سے خواب

دیکھے، زندگی کے حسن کے، انسانوں کی بہتری کے لیے بہت سی شامیں ساتھ گزاریں اور متعدد آزمائشوں میں سے گزرے۔ 1951 میں جب میں سال بھر قید تنہائی میں رہا، سبط کسی اور جیل میں محبوس تھے، میں ایک برس بعد رہا ہوا وہ ڈھائی تین برس زندانی رہے اور یہ ایسی قید تھی جس میں کوئی ملاقاتی ان سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ جو لوگ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں انھیں اس بات کا علم ہے کہ جیل میں ملاقاتیوں کا آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ نظر بند ایک ایک دن گن گن کر گزارتے ہیں، اور پندرہ دن بعد ملاقات کی امید میں جیتے ہیں۔ مگر سبط حسن سے تین برس تک ملنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے کہ نظر بندی کے قوانین کی رو سے سیاسی قیدیوں سے صرف قریبی عزیز ہی ملاقات کر سکتے ہیں۔ ان کا کوئی قریبی عزیز موجود نہیں تھا،..... دوست بہت تھے اور ان کے لیے تڑپنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مگر انھوں نے تنہا ہی یہ مرحلہ طے کیا۔

سبط حسن کے پاکستان آنے سے پہلے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ 1946 کے اوائل میں جب میں بمبئی گیا وہ اس سے چند ہی روز قبل امریکہ جا چکے تھے۔ البتہ ان کی نزاکتوں اور نفاستوں کا ذکر بہت سنا۔ علی سردار جعفری، کرشن چندر اور سید سجاد ظہیر کی زبانی دو برس تک ان کا ذکر سنتے رہے، مگر ملاقات لاہور میں ہوئی۔ لاہور آکر انھیں سب سے پہلے مجھ سے ملنا تھا۔ وہ فرضی نام پر لاہور آئے تھے۔ اس لیے کہ پنجاب پولیس کے پاس ان کی گرفتاری کے وارنٹ پہلے سے موجود تھے، ان دنوں اس شہر لاہور میں میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ نیا نیا مہاجر بن کر یہاں وارد ہوا تھا۔ سبط دو روز تک مجھے تلاش کرتے رہے۔ قیام فلیٹیز ہوٹل میں تھا۔ کراچی سے لاہور پہنچنے پر ریلوے سٹیشن کے باہر ان کے شاندار لباس اور امیرانہ وضع قطع دیکھ کر ایک ایجنٹ انھیں فلیٹیز ہوٹل لے آیا تھا، دو روز بعد ملاقات ہوئی تو پہلی بات یہی کہی کہ ''بہت بُرے ہوٹل میں پھنس گیا ہوں، ہر طرف اندھیرا ہے، کمرے گندے ہیں اور بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے، کسی بہتر جگہ پر رہائش کا انتظام کر دیجیے۔''

میں نے کہا ''حضرت یہ تو راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ شہر میں اس سے بہتر تو کوئی جگہ موجود ہی نہیں ہے۔'' حقیقتاً 1948 میں لاہور میں فلیٹیز سے بہتر کوئی ہوٹل موجود نہیں تھا۔ مگر سیّد سبط حسن کی نفاست پسند طبیعت پر یہ بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ بہرحال اگلے روز کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ غالباً کسی دوست کے گھر اور زیرِ زمین رہتے ہوئے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

کیسی کیسی پریشانیاں

سبط حسن اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کی باتیں، ان کے اصول ان کی انا، خودداری، روشن خیالی اور صاف گوئی کی عادت ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہے گی۔ اس شہر لاہور میں سبط کو کیسی کیسی پریشانیوں میں سے گزرنا پڑا۔ مصیبتوں اور آزمائشوں کے کیسے کیسے دور آئے مگر ان کی زبان سے حرف شکایت کبھی نہیں نکلا۔ ہاں البتہ خوبانِ لکھنؤ کو ضرور یاد کرتے، مگر اپنی ذاتی تکلیف یا پریشانی کا کبھی ذکر نہ کیا۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا، اس دنیا کو بدلنے اور بہتر بنانے کا، استحصال، ظلم اور جبر کے خاتمے کا۔ سبط کو ہر خوبصورت چیز سے پیار تھا۔ پھولوں سے، بچوں سے، حسین لوگوں سے، خوبصورت چہروں سے، ان کی جمال پرستی کے بہت سے قصے مشہور ہیں اور بہت سوں کے ہم عینی گواہ بھی ہیں اور اسی پیمانے سے وہ اس دنیا کو سنوارنا چاہتے تھے، زندگی کے آخری دس بارہ برس میں انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے بڑا ٹھوس کام کیا۔ جو کام جماعتوں اور اداروں کے کرنے کا تھا۔ یعنی فکری لحاظ سے لوگوں کو اور معاشرے کو تبدیلی کے لیے تیار کرنے اور توہمات اور تعصّبات سے بچانے کا وہ انھوں نے تن تنہا انجام دیا۔ مجھے یاد ہے غالباً 1974 میں، میں چند روز کے لیے کراچی میں ان کے گھر ٹھہرا تھا۔ ایک رات میں نے شکایت کی کہ آپ لوگوں سے ملتے نہیں۔ بہت سے لوگ شاکی ہیں کہ آپ بالکل گوشہ نشین ہو گئے ہیں، کہنے لگے "بھئی وقت بہت کم ہے اور کام بہت ہے، اس لیے میں ملاقاتیں کرنے کی بجائے کام کرتا ہوں۔" اس پر ہمارے درمیان کافی دیر بحث رہی۔ میں نے کہا آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ وقت کم ہے۔ ٹھیک ہے کرنے کے بہت کام باقی ہیں مگر زندگی کے بارے میں یہ سوچ مریضانہ ہے۔ اگلے روز میں نے بیٹی نوشابہ سے کہا اپنے ابو کے دماغ سے یہ بات نکال۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اسی دس بارہ برس میں انھوں نے......... موسیٰ سے مارکس تک، انقلاب ایران اور نوید فکر جیسی معرکتہ الاراء تصانیف مکمل کیں۔ اس سے قبل ماضی کے مزار اور شہر نگاراں شاید مکمل کر چکے تھے باقی کتابیں جن میں ان کی آخری کتاب بھی شامل ہے اور جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی..... گذشتہ بارہ برس کی تخلیقات ہیں۔ اس تمام عرصے میں وہ اپنی دھن میں کام کرتے رہے، اپنے مضامین تصانیف اور لیکچروں کے ذریعے انھوں نے رواداری، روشن خیالی، سائنسی سوچ اور فکر کے نئے اور بلند مینار تعمیر کیے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے دوران میں لندن (اگست 1985ء) اور کراچی (مارچ 1986ء) میں بار بار اس پریشانی کا اظہار کرتے تھے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ ملا، پیران حرم اور ان کے گماشتے حکمرانوں

کے ساتھ مل کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ عام انسانوں کو ان کے روزمرہ کے مسائل کا ادراک نہیں کرنے دیتے اور انھیں توہمات اور تعصبات کے کنوئیں میں دھکیل رہے ہیں۔ جس سائنسی سوچ اور روشن خیالی کی بنیاد سرسید احمد خاں نے ڈالی تھی۔ آج ہم اس سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ ان کی آخری دنوں کی تصانیف اسی موضوع پر مشتمل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دور میں ثقافتی، ادبی، تہذیبی اور فکری میدان میں کام کرنے والے نوجوان بہت عرصے تک سبط کی نگارشات سے راہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

میرے استاد

سبط میرے دوست ہی نہیں استاد بھی تھے۔ لاہور آنے کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ نیا زمانہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مگر چونکہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ تھے، اس لیے وہ ''زیر زمین'' رہ کر پرچہ مرتب کرتے تھے۔ بظاہر میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ احمد راہی اور بشیر ظفر ایڈووکیٹ بھی اس اخبار میں رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔ حکومت نے نیا زمانہ کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا تو اپنا وطن، سحر اور دوسرے ناموں سے ہم ہی لوگ یہ پرچہ شائع کرتے رہے۔ یہ ایک مکمل اخبار تھا، اس زمانے میں اس کی خوبیوں کی داد احمد راہی، بشیر ظفر اور میں سمیٹتے رہے۔ اس لیے کہ بظاہر ہم ہی یہ اخبار نکالتے تھے بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ اس معیاری ہفت روزہ اخبار کی تدوین ترتیب......... اصل میں کس کی ذمہ داری ہے۔ میں صحافتی دنیا میں نووارد تھا۔ چند ادبی کہانیاں ضرور لکھ چکا تھا۔ اخبار نویسی سبط حسن سے سیکھی۔ ہر ہفتے مختلف موضوعات پر لکھنے کے لیے مختلف دوستوں کی ڈیوٹی لگتی۔ میرا کام ان تمام مسودات کو جمع کر کے سبط کو پہنچانا اور پھر ان کی قطع و برید کے بعد کتابت کرا کے شائع کرانا تھا۔ ابتداء ہی میں مجھے کسی خاص موضوع پر لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ سبط نے میرا آدھے سے زیادہ مضمون کاٹ کر پھینک دیا۔ میں چونکہ ادب کا طالب علم تھا، اس لیے لفاظی اور زبان کی چاشنی پر زیادہ توجہ دیتا۔ سبط ایک بھی فالتو لفظ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ بغیر دلیل کے کسی دعویٰ کو چھاپنے پر رضامند نہ ہوتے، اعداد و شمار کے بغیر کسی فیصلے کا اعلان کرنے کے حق میں نہ ہوتے۔ یہ سلوک میرے مضامین ہی کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ سبھی لکھنے والوں کے صفحے کے صفحے قلمزد ہو جاتے۔ ہمارے ایک دوست زور بیان میں کہیں کے کہیں نکل جانے کے عادی تھے۔ ان کا مضمون ہاتھ میں آتے ہی ہمیشہ کہتے۔ ''معاذ اللہ، آپ لوگوں نے کیسے کیسے ''سلطان القلم'' پال رکھے ہیں جو لکھنے پر آتے ہیں تو پلٹ کر دیکھتے

ہی نہیں۔ اکثر اوقات ان کے دس صفحے کے مضمون کو سبط تین چار پیراگراف میں بدل دیتے اور اس طرح الجھی ہوئی تحریر کی وجہ سے جو بات قاری کی سمجھ میں شاید نہ آسکتی واضح اور دوٹوک شکل میں آتی۔ اس کانٹ چھانٹ کے نتیجے میں یہ اخبار موثر اور بامعنی ہوتا۔ سبط حسن جس طرح زندگی بھر فالتو بات کرنے سے گریز کرتے رہے اس طرح انھوں نے کبھی کوئی غیر ضروری فقرہ لکھا بھی نہیں، بغیر دلیل اور منطق کے کبھی کچھ نہیں لکھا۔

نفاست پسندی

ذاتی زندگی میں وہ خوش پوش، نفاست پسند، مہذب اور انتہائی نرم گفتار تھے۔ معاشی طور پر بدترین حالات میں بھی ان کے لباس پر کسی نے کبھی شکن نہیں دیکھی۔ گرمیوں میں کرتہ شلوار پہن کر گھر سے نکلتے تو واپس آکر دوبارہ باہر جانے کے لیے کبھی وہ جوڑا استعمال نہیں کیا۔ شام کو دوبارہ دھوبی کا دھلا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے تھے ہم نے بہت دفعہ کہا ''سید صاحب آپ کے وارڈ روب کا خرچہ بہت ہے۔ اسے کم نہیں کیا جاسکتا؟'' جواب ہمیشہ یہی ہوتا ''بھئی ایک دفعہ پسینہ جذب ہونے کے بعد وہ کپڑا دوبارہ کیسے پہنا جاسکتا ہے۔'' سبط خواتین میں ہمیشہ بہت مقبول رہے اور یہ بات ہمارے جیسے دوستوں کے لیے اکثر رشک وحسد کا باعث بنتی رہی، ایک دفعہ میں نے ایک خاتون سے جو اصل میں میری دوست تھی اور جس سے میری ہی وجہ سے سبط کا ربط تھا..... پوچھا کہ ان کی خواتین میں مقبولیت کی وجہ کیا ہے ہمیں بھی تو کچھ پتہ چلے۔ اس نے کہا سبط جب اس سے بات کرتے ہیں تو اسے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے ادھر ادھر آس پاس بلکہ پوری دنیا میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ بس ہم ہی ہم ہیں۔ اپنے سے جونیئر لوگوں بالخصوص اپنی بچی سے ہمیشہ یہ کہتے تھے اپنے کسی فعل، کسی کام کے بارے میں کسی کے سامنے کوئی وضاحت نہ کرو۔ ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھو اور خود اپنے کو بتاؤ کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا، کسی دوسرے کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر میں ان کا کہنا تھا کہ کوئی بلند آواز سے نہ بولے۔ کیونکہ بک بک کرنا ہماری تہذیب میں معیوب ہے۔ روایات کی پاسداری کا یہ عالم تھا کہ 1950 میں مزدوروں کے ایک جلسے میں نصیر انور مرحوم اور میں نے سٹیج پر کلاسیکل موسیقی پیروڈی کی شکل میں پیش کی۔ سبط بھی اس جلسے میں چھپے بیٹھے تھے۔ شام کو میں ملا تو میری بہت کھنچائی کی، کہنے لگے ''جہالت کی اس سے بڑھ کر کوئی نمائش ہوسکتی ہے؟ کلاسیکی موسیقی ہماری تہذیب اور روایات کا حصہ ہے۔ آپ لوگوں کو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔'' رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ ہم دونوں کے درمیان کسی قسم کا

تکلف نہیں تھا اور وہ ابتداء ہی سے پہچان گئے تھے کہ عام دنیاوی معاملات میں، میں خاصہ احمق ہوں ہر کسی پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ اپنے نفع نقصان کے بارے میں نہیں سوچتا۔ مگر جب کبھی میری کسی حماقت کا ذکر ہوتا تو ہمیشہ یہی کہتے۔ ''بھئی آپ بہت بھولے آدمی ہیں۔'' گذشتہ برس جب میری کسی حماقت پر انھوں نے بہت غصے سے کہا۔ ''بھائی آپ کی بے وقوفی کی کوئی حد بھی ہے۔'' تو میں نے خوشی سے نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کلمہ حق کہنے کے لیے آپ نے چالیس برس انتظار کیا۔ چلیے صحیح بات آپ کی زبان پر آئی تو.........''

ڈسپلن

سبط حسن کی زندگی بہت منظم تھی، رہنے سہنے کا انھوں نے ایک معیار قائم کر رکھا تھا جو بدترین حالات میں بھی قائم رہا۔ صفائی کے بہت پابند تھے اور ان کے کمرے میں ہر چیز قرینے سے رکھی رہتی تھی، عام طور سے غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتے، 1954 میں جب میں دوبارہ جیل گیا تو اتفاق سے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ ہم کچھ عرصہ اکٹھے جیل میں رہے۔ ہر صبح ان کا بستر دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ ہم لوگوں کے بستر صبح اس حالت میں ہوتے کہ دری کہیں ہے، تکیہ کہیں ہے اور چادر کہیں الگ پڑی ہے۔ مگر رات بھر سو کر اٹھنے کے بعد سبط کے بستر پر شکن تک نہیں ہوتی تھی، اس پر سب لوگ ان کا مذاق اڑاتے، بلکہ میں نے تو اعلان کر رکھا تھا کہ بستر کو صحیح حالت میں رکھنے کے لیے سبط اس پر نہیں سوتے بلکہ کرسی پر سوتے ہیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کبھی کبھی ہمارے وارڈ میں آتے اور کرسی پر براجمان ہو کر پند و نصائح کا دفتر کھول دیتے۔ سبط ایسے موقعہ پر ہمیشہ ادھر ادھر ہو جاتے۔ میں تکلفاً سپرنٹنڈنٹ صاحب کی باتیں سنتا اور ہوں ہاں کرتا رہتا۔ ایک روز سبط کہنے لگے۔ یہ حمید اختر کمال کا آدمی ہے۔ یہ ہر بور آدمی کے ساتھ گھنٹوں گفتگو کر سکتا ہے۔'' ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی غیر پسندیدہ آدمی کے ساتھ بات بھی کر لیں۔ اپنی طبیعت اور ضمیر کے خلاف عمر بھر کوئی کام نہیں کیا۔ بات ضروری اور مختصر کرتے، انڈر گراؤنڈ زمانے میں ایک روز میں انھیں اپنے پرانے دوست فیض الحسن کے (جو گذشتہ 32 برس سے لندن میں مقیم ہیں) گھر لے گیا۔ فیض الحسن سے فرضی نام سے سبط کا تعارف کرایا۔ یہ دوست جنسی کتابوں کے بہت رسیا تھے اور ان کے اس کمرے میں جہاں ہم بیٹھے تھے جنسی انسائیکلوپیڈیا قسم کی بے شمار کتابیں رکھی تھیں۔ سبط نے ان کتابوں پر نظر ڈالی اور فیض الحسن سے پوچھا۔ ''یہ کتابیں کون پڑھتا ہے؟''

فیض الحسن نے کہا ''میں پڑھتا ہوں، آپ بھی پڑھیے جو کتاب پسند ہو لے جائیے۔''
''میاں سیکس پڑھنے کی نہیں کرنے کی چیز ہے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' فیض الحسن کے لیے یہ جواب کافی تھا۔ یہ غالباً 1953 ستمبر کا ذکر ہے۔. سبط کو جیل سے رہا ہو کر آئے کچھ ہی دن گزرے تھے اور وہ مال روڈ کے پیچھے نقی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ انہی دنوں دریائے راوی کا پانی لاہور کے رہائشی علاقوں میں داخل ہو گیا تھا۔ میں ان دنوں سنت نگر میں رہتا تھا دن کے وقت میں دفتر امروز میں ڈیوٹی پر تھا کہ پتہ چلا سنت نگر اور کرشن نگر کے محلے زیر آب ہیں اور تمام راستے بند ہیں۔ گھر میں میری بہن اور کم عمر بھتیجی تھی۔ بڑے بھائی لاہور سے باہر تھے۔ مجھے بہن اور بھتیجی کی فکر تھی۔ ادھر پانی یونیورسٹی کے باہر تک آ گیا تھا۔ دیو سماج روڈ پر جو میرا راستہ تھا چھ سات فٹ پانی تھا۔ اسی سڑک پر مرحوم صوفی تبسم صاحب کا گھر تھا، پتہ چلا وہ بھی رات سے چھت پر بیٹھے ہیں۔ سبط اور میں ساری شام ادھر ادھر کا چکر لگاتے رہے۔ مگر گھر تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ رات ایک بجے تک ہم لوگ ٹی ہاؤس میں بیٹھے اور وقفے وقفے سے زمزمہ توپ کے پاس جا کر پانی کا زور دیکھتے رہے۔ مگر پانی کم ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے ایک بجے کے بعد وہاں سے اٹھ کر نقی بلڈنگ میں سبط کے گھر آئے۔ مگر پریشانی کی وجہ سے سو نہ سکے۔ صبح پتہ چلا کہ پانی کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے میری پریشانی دیکھتے ہوئے سبط نے اعلان کیا کہ وہ تیر کر میرے گھر جائیں گے اور بہن کی خیریت معلوم کر کے آئیں گے۔ میں نے انھیں بہت روکا، اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی خطرہ تھا وہ بہت اچھے تیراک تھے، مگر ان کی نفاست طبع کی وجہ سے مجھے معلوم تھا کہ اس گندے اور غلیظ پانی میں سے گزر کر جانا ان کے لیے کس قدر مشکل ہوگا۔ دریا کے پانی کے ساتھ علاقے کی ساری غلاظت، حشرات الارض سانپ بچھو وغیرہ بھی بکثرت موجود تھے۔ مگر سبط اس پانی میں سے گزر کر نہ صرف میرے گھر گئے، بلکہ وہاں کچھ دیر رکنے کے بعد اس سے آگے کرشن نگر میں عائشہ جمال (ہاجرہ مسرور کی بڑی بہن) کے ہاں بھی گئے اور دو گھنٹے بعد واپس آ کر ہم لوگوں کو گھر والوں کی خیریت سے آگاہ کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے بعد وہ مسلسل کئی دن بار بار نہاتے اور پوڈر ملتے رہے۔ کہتے تھے ناک سے گندے پانی کی بدبو نہیں جاتی۔ اس شام میں گورنمنٹ کالج سے ہوتا ہوا گھوڑا ہسپتال جا کر وہاں سے کشتی میں سوار ہو کر گھر پہنچا تھا۔ ہمارے گھر میں خیریت تھی، مکان کی دوسری منزل پانی سے محفوظ رہی تھی۔ نچلی منزل میں البتہ چھ سات فٹ پانی ہی پانی تھا۔

جیل کی باتیں

9 جولائی سے ستمبر 54 تک ہم بارہ چودہ آدمی لاہور سنٹرل جیل کے بم وارڈ میں رہے۔ ہمارے ساتھ مرحوم لال خان، مرحوم دادا منصور، مرحوم محمد افضل، شمیم اشرف ملک، مرزا ابراہیم، رؤف ملک، کامریڈ غلام محمد، سی آر اسلم اور بہت سے دوسرے ساتھی تھے۔ ہم لوگوں نے اپنے وارڈ میں والی بال کی ٹیم بنائی۔ روزانہ شام کو دو تین گھنٹے والی بال کھیلتے، یہاں بھی سبط بے قاعدگی برداشت نہ کرتے، ساتھیوں سے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا کہ جو بال ان کی طرف آرہا تھا اسے دوسرے بھاگ کر کیوں اٹھاتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچنا شروع کر دیا۔ روزانہ اعلان ہوتا ''یہ میرا علاقہ ہے اگر یہاں کوئی آیا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

لاہور سنٹرل جیل کے یہ تین مہینے بہت اچھے گزرے، سبط، سی آر اسلم اور افضل مرحوم دن بھر شطرنج کھیلتے، ہم لوگ تاش کی بازی لگاتے، اس کام کے لیے بم وارڈ میں جہاں ہم سب کی علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیاں تھیں وہاں ایک بڑا ہال بھی تھا۔ جہاں کھیل بھی ہوتا، سیاسی بحثیں بھی جاری رہتیں، اور لطیفہ بازی کے دور بھی ہوتے۔ جیل پہنچتے ہی میری تجویز پر ہم سب لوگوں نے احتجاج کے طور پر سر کے بال منڈوا دیے تھے۔ پورے کے پورے چودہ آدمیوں نے حجام کو بلا کر استرے سے سر صاف کرائے تھے۔ تیسرے دن اس زمانے کے آئی جی جیل خانہ جات کرنل بشیر سید آئے تو اتنے سارے سیاسی قیدیوں کے چٹیل سر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ اور کافی دیر تک پوچھتے رہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔ سبط کا اس دفعہ بھی کوئی ملاقاتی نہیں تھا۔ باقی سب نظر بندوں کے گھر والے ہر پندرہ روز کے بعد آتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان، سگریٹ، مٹھائی، پھل غرضیکہ ہر ایک کے گھر سے ملاقات پر حسب توفیق سامان آتا۔ سبط واحد نظر بند تھے۔ جس کا کوئی ملنے والا نہ تھا۔ مگر انھوں نے اس پر کبھی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ جیل میں انھوں نے حقے کا دیسی تمبا کو جسے وہ کھبڑ کا نام دیتے تھے۔ صاف کر کے پائپ میں پینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ دو تین ماہ کے لیے آٹھ دس روپے کا تین چار سیر دیسی تمباکو ان کی واحد ضرورت تھی۔ باقی یہ تین مہینے بڑے مزے میں گزرے۔ حتیٰ کہ ہم لوگوں کو علیحدہ علیحدہ گروپوں میں پنجاب کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ لال خان مرحوم، ڈاکٹر عبداللہ، مرزا محمد ابراہیم، کامریڈ غلام محمد اور میں میانوالی جیل بھیجے گئے۔ سبط اور دوسرے ساتھی کیمبل پور اور کچھ دوسری جیلوں میں گئے۔ جانے سے پہلے ہم لوگوں نے اپنی نظر بندی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں رٹ درخواست دائر کر دی تھی۔ چنانچہ جنوری 1955 میں اس کی سماعت کے لیے ہم سب لوگوں کو واپس لاہور لایا گیا اور ہائی کورٹ کے حکم سے اسی ماہ یہیں سے

رہا کیا گیا اسی روز اردو کے منفرد افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا انتقال ہوا تھا۔

جیل کے نمبرداروں اور مشقتیوں کے لیے سبط حسن کا نام کچھ مشکل تھا۔ چنانچہ اس تمام عرصے میں سیّد صاحب کو سیفٹی حسن کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی تھا، وہ سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھے جیل کے عملے نے انھیں سیفٹی حسن کا نام دے دیا۔ یہاں تک تو خیریت تھی۔ ایک روز سبط کے لیے ڈیوڑھی سے بلاوا آیا۔ جو نمبردار انھیں لینے وارڈ میں آیا۔ اس نے آتے ہی اعلان کیا۔ "صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر سید سفل حسن کو یاد کر رہے ہیں۔" یاروں نے اس پر قہقہہ لگایا تو سبط نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "بھائیو! اس کو یہیں تک رکھنا، باہر جا کے کسی کو نہ بتانا ورنہ بھائی لوگ اسی نام سے پکارنے لگیں گے۔"

لیل و نہار

گرفتاری سے ڈیڑھ برس قبل میں امروز کے ادارتی عملہ میں شامل ہو چکا تھا۔ رہائی کے بعد واپس امروز میں کام شروع کر دیا۔ سبط کچھ دنوں بیکار رہے۔ مگر ان کے مشاغل، رہن سہن، معیار زندگی، صفائی ستھرائی، نفاست، اور نزاکت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس زمانے میں امروز اور پاکستان ٹائمز کے بانی مرحوم میاں افتخار الدین کو ایک ہفت روزہ نکالنے کا خیال آیا اور لیل و نہار کے نام سے ڈیکلریشن لے لیا گیا۔ تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایڈیٹر کی تلاش ہونے لگی۔ ایک روز میاں صاحب امروز کے دفتر آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر اس ہفت روزہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کافی دیر بعد اٹھ کر جانے لگے تو اچانک مجھ سے پوچھا۔ "لیل و نہار کا ایڈیٹر کسے بنائیں؟"

"میں نے فوراً کہا، "سبط حسن کو۔"

"اس لیے کہ وہ تمھارا دوست ہے۔" میاں صاحب نے کہا۔

میں نے انھیں بتایا کہ سبط میرے دوست ضرور ہیں مگر اس پیشے میں انھیں میں اپنا استاد مانتا ہوں اور یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس وقت پاکستان میں اردو انگریزی صحافت میں ان سے بڑا شاید ہی کوئی دوسرا نام موجود ہو۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میاں صاحب نے سبط حسن کو میرے کہنے پر لیل و نہار کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کے بعد بھی سبھی متعلقہ لوگوں سے بحث مباحثہ کرتے رہتے، دوسروں کی سنتے، اپنی رائے دیتے اور بالآخر اپنے فیصلے کو اجتماعی فیصلہ بنا کر لاگو کرتے۔ میری رائے اب بھی یہی ہے کہ انھوں نے سبط کو ایڈیٹر مقرر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ محض ہماری

رائے معلوم کرنے اور اپنے فیصلے کو مزید پختہ کرنے کے لیے ہم سے مشورہ کر رہے تھے۔

بہر حال لیل و نہار سبط کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے معیار اور محاسن کے بارے میں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ رسالہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اور اس ملک کا کوئی ہفت روزہ اس کے معیار کو چھو تک نہیں سکا۔ میں یہاں اس زمانے میں سبط کی ذاتی زندگی کا ذکر کروں گا۔ لیل و نہار کی اشاعت کے دو تین برس میں سبط حسن کو پہلی بار سکون سے کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اور ان کے ذاتی اور قریبی دوستوں کے علاوہ دوسروں کو بھی پہلی بار ان کی صلاحیتوں کا پتہ چلا۔

یہ دو تین برس ہم نے ایک ہی دفتر میں گزارے، دوپہر کا کھانا احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، ظہیر بابر اور میں قاسمی صاحب کے کمرے میں کھاتے اور کھانے کا یہ سیشن تبادلہ خیالات اور لطیفہ بازی کے لیے مخصوص ہوتا، فیض صاحب بھی انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آ گئے اور پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار کے چیف ایڈیٹر کے طور پر ان کا نام آنے لگا۔ مگر کچھ عرصے بعد بوجوہ پروگریسو پیپرز لمٹیڈ سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں سبط حسن کی ذاتی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا۔

ملاپ

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، سبط برصغیر کی آزادی سے کئی برس قبل اپنا گاؤں بیوی، بچی، عزیز، رشتہ دار سبھی کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی کے مشن کی تکمیل کے لیے لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی اور نیویاک میں رہے۔ ایک دفعہ گھر چھوڑا تو پھر اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا۔ نیویارک ہی سے لاہور آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔ 1955 سے لے کر 1962 تک میرا ان کا شب و روز کا ساتھ رہا۔ مگر میرے ساتھ بھی انھوں نے اپنے اہل خاندان کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس دور میں وہ ایک طرح سے ہمارے خاندان کا حصہ تھے۔ 1956 میں میری شادی ہوئی، میں بوجوہ اس وقت شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ میرے بڑے بھائی مرحوم اور میری بہن نے سبط حسن کو درمیان میں ڈالا اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ اس کے بعد دونوں بڑی بچیوں صبا اور ہما کی ولادت 1957 اور 1960 میں ہوئی۔ جب میرا اور سبط کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ ان کے سامنے پلیں، بڑھیں اور ان کو گھر کے فرد ہی کی طرح جانتی تھیں، ان کی ذات اور ان کے خیالات کے سوا ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور سنا تھا کہ اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ان کی جاگیر میں تھا۔ جسے وہ

بیوی اور بچی کے حوالے کر کے گھر سے نکل گئے تھے، اور یہ اعلان کر گئے تھے کہ اب اس گھر یا جاگیر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ برس ہا برس تک کسی سے ملے ہی نہیں۔

لیل و نہار کی ادارت کے زمانے میں انھیں کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانا تھا۔ روانگی کی تیاریوں کے وقت البتہ انھوں نے پہلی بار مجھ سے کہا کہ ان کی بیٹی ڈھاکہ میں ہے وہاں وہ اسے ملیں گے۔

سبط حسن جب نوشابہ کو چھوڑ کر گھر سے نکلے تھے۔ اس وقت وہ تین چار برس کی بچی تھی۔ اب وہ ڈھاکہ پہنچے تو بیٹی بی اے میں پڑھتی تھی۔ ہم لوگ تاریخی ملاقات دیکھنے کے لیے وہاں موجود تو نہیں تھے، مگر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ کیسی ملاقات ہوگی۔ ڈھاکہ میں نوشابہ اپنے ایک خالو کے ہاں مقیم تھی جو ایک انتہائی مہذب، لائق اور اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ بظاہر ان ماں بیٹیوں کو وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن یہ بچی غالباً باپ کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ محسوس کرتی تھی۔ ایسی سہیلیوں سے مل کر جن کے ماں باپ ان کے ساتھ تھے، وہ اور بھی اداس اور دکھی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ سبط ڈھاکہ پہنچے تو بچی نے ان کو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑا۔ وہ انھیں اپنے ساتھ لے کر کالج گئی، پرنسپل اور پروفیسروں سے ملایا۔ اپنی تمام سہیلیوں اور ان کے اہل خاندان سے ملاقات کرائی۔ اور سائے کی طرح ان کے قیام ڈھاکہ میں ان کے ساتھ چپکی رہی۔ خود سبط بھی اس سے علیٰحدہ ہونے کو تیار نہیں تھے۔ سبط حسن اپنی واپسی کا پروگرام دو چار روز تک ٹالتے رہے۔ لیکن جب بالآخر آنے لگے تو نوشابہ نے ان کے ساتھ لاہور جانے کا اعلان کر دیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ لیل و نہار کی ادارت کے زمانے میں انھوں نے تقی بلڈنگ کا فلیٹ چھوڑ دیا تھا اور سمن آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ہم سب دوستوں بالخصوص میرے گھر والوں کے لیے سبط کے گھر پر ان کی بیٹی کی آمد ایک زبردست اور خوشگوار تبدیلی تھی۔ بچی کو کچھ روز بعد کنیئرڈ کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خاں کا مارشل لاء پورے زوروں پر تھا لیکن امروز، پاکستان ٹائمز اور لیل و نہار چلانے والی کمپنی پروگریسو پیپرز لمٹیڈ پر ابھی ایوب حکومت نے قبضہ نہیں کیا تھا۔ فیض صاحب دو تین برس باہر گزار کر دوستوں کے منع کرنے کے باوجود وطن واپس آنے والے تھے اور ہم سب کو ان کا شدت سے انتظار تھا۔ لیکن ان کی آمد سے قبل ہی سبط حسن اور احمد ندیم قاسمی کو ایک دفعہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ چند روز بعد فیض واپس آئے تو اگلے ہی دن انھیں پکڑ لیا گیا۔ سبط کی گرفتاری کے بعد نوشابہ اکیلی رہ گئی۔ سبط کے لیے جیل کے یہ دن بہت سخت تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ بچی کی وجہ سے سخت پریشان ہیں ورنہ جیل ان کے لیے نئی بات نہ تھی، میں نے

جیل میں ان سے چوری چھپے ملاقات کر کے بہت لعن طعن کی اور کہا کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو بچی کے بارے میں کیوں پریشانی ہے؟ بحر حال اس ملاقات کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ بچی ہمارے ہاں آ گئی اور وہاں سے اسے کنیئرڈ کالج کے ہوسٹل میں بھجوا دیا گیا۔

خوش قسمتی سے یہ سب لوگ دو ڈھائی ماہ بعد ہی رہا ہو گئے۔ اب مشکل یہ آن پڑی تھی کہ نوشابہ جو باپ کے ساتھ آ گئی تھی۔ اپنی ماں کے لیے اداس رہنے لگی۔ سبط حسن کا بو جوہ اپنی بیگم کو لاہور لانے کا ارادہ نہیں تھا۔ مگر بیٹی کی حالت دیکھ کر انھوں نے خط لکھ کر بیگم کو بھی بلا لیا اور اس طرح تقریباً پندرہ برس کی جدائی کے بعد یہ خاندان ایک بار پھر سے یکجا ہوا۔

لیل و نہار سے برطرفی

خاندان تو اکٹھا ہو گیا تھا مگر سبط کے امن وسکون کے یہ تین چار برس ختم ہو گئے۔ ایوب حکومت نے 1960-59 میں پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار پر قبضہ کر لیا۔ جس حکم نامے کی رو سے ان اخبارات کو چلانے والے ادارے کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تھا۔ اس میں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ سٹاف میں کوئی ردو بدل نہیں ہوگا اور یہ کہ اس ادارے میں کام کرنے والے سبھی صحافی بدستور کام کرتے رہیں گے۔ سبط کو البتہ اسی روز فارغ کر دیا گیا۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میں سینکڑوں صحافی کام کر رہے تھے حکومت کی کوشش اور خواہش یہی تھی کہ سب لوگ کام کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ جب مظہر علی اور احمد ندیم قاسمی نے پاکستان ٹائمز اور امروز کی ادارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تو کئی روز تک ان کو واپس لانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ البتہ سبط حسن کی برطرفی غالباً نئے مقرر ہونے والے ایڈمنسٹریٹر مرحوم سرفراز کا پہلا تحریری حکم نامہ تھا جو انھوں نے چارج لینے کے بعد جاری کیا۔

مرحوم سرفراز احمد پرانے صحافی اور منجھے ہوئے بیوروکریٹ تھے۔ انھوں نے برطرفی کا حکم نامہ دینے کے لیے سبط حسن کو اپنے کمرے میں بلایا اور یہ پیشکش کی کہ حکومت انھیں زمین، مکان اور کارخانہ تک الاٹ کرنے کو تیار ہے۔ کوئی دوسرا کام بھی جوان کی معاش کے لیے موزوں ہو دیا جا سکتا ہے۔ البتہ انھیں لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ملک کے اخبارات اور رسائل کے دروازے ان پر بند ہیں، اس کے سوا وہ جو مانگیں انھیں مل جائے گا۔ لیل و نہار کے دو تین برس کے شماروں کے علاوہ غالباً حکومت کے پاس ان کی زوردار تحریروں کے کچھ اور ثبوت بھی موجود تھے۔ مثلاً ''انقلابِ چین زندہ باد'' انھوں نے لکھا تھا جس پر کسی کا نام نہ تھا اور جسے حکومت پنجاب نے

ضبط کر لیا تھا اور اسی ضبطی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں مہینوں مقدمہ چلتا رہا تھا۔1951 میں گرفتاری سے قبل وہ تین چار برس ''زیرزمین'' رہے تھے۔اس لیے ان کی تحریروں پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا۔راولپنڈی سازش کیس کے بعد سینکڑوں افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ان میں سے اکثر پر لاہور کے شاہی قلعہ میں تشدد کیا گیا اور اس طرح دیگر معلومات کے علاوہ تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہوئی ان تحریروں کے لکھنے والے کی بھی نشاندہی ہوگئی تھی چنانچہ حکومت کا فیصلہ.........تھا کہ اس آدمی کو لکھنے اور اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔یہی وجہ تھی کہ ان کو کوئی اور کام کرنے اور حکومت کی طرف سے ہر سہولت مہیا کرنے کی پیشکش کی گئی اور کہا گیا کہ جس دشت کی سیاحی میں انھوں نے اپنی عمر گزاری ہے اس سے کنارہ کش ہو جائیں۔سبط حسن سرفراز صاحب کا شکریہ ادا کر کے پی پی ایل کی سیڑھیوں سے اتر گئے۔اس پیشکش کا تذکرہ انھوں نے میرے سوا غالباً کسی نے نہیں کیا۔کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب میں نے یہ بات کی تو ان کے گھر والوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ سبط نے اس سارے زمانے میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

سبط حسن کے لکھنے پڑھنے پر پابندی کے بارے میں سب سے اچھا تبصرہ مادام نور جہاں کا تھا۔انھوں نے اسی زمانے میں ایک روز مجھ سے سبط کی خیریت پوچھی تو میں نے بتایا کہ سرکار انھیں مال و دولت، زمین، مکان، کارخانہ بھی کچھ دینے کو تیار ہے مگر انھیں لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔مادام نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا۔مگر دو منٹ بعد بڑی بلند آواز سے بولیں۔''ہائے! یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی مجھ سے کہے تم گا نہیں سکتیں۔''

اذیتوں کا دور

لیل و نہار سے برطرفی کے بعد سبط حسن کے لیے زندہ رہنے، مکان کا کرایہ اور کچن چلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ان کے دوست اور ہم سب کے محترم روشن علی بھیم جی نے انھیں کراچی آنے اور ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں اپنی مرضی کا کام کرنے کی پیشکش کی۔مگر سبط کسی قیمت پر لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔لاہور میں تین برس دھکے کھانے کے بعد بالآخر انھیں کراچی جانا پڑا اور میں سمجھتا ہوں کہ سبط نے زندگی کے آخری دس بارہ برس میں جو ٹھوس علمی کام کیا ہے اس کا سہرا سبط کے بعد بھیم جی اور مکتبہ دانیال کے ملک نورانی کے سر ہے۔روشن علی بھیم جی نے انھیں جم کر کام کرنے کا موقعہ دیا اور ملک نورانی نے ان کی بظاہر خشک علمی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھال لی۔

کراچی وہ بالکل مجبور ہو کر گئے تھے۔لیل و نہار سے برطرفی کے بعد انھوں نے لاہور میں

تقریباً دو برس بہت برے حالات میں گزارے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں انھوں نے بہت سے کام اپنی طبیعت کے خلاف کیے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست اے رحمٰن کی ایک فیکٹری میں وہ بطور لیبر ویلفیئر آفیسر کام کرتے رہے، یہ دوست امپریل الیکٹرک کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر اور سبط کے پرانے دوست تھے۔ انھوں نے سبط کو یہ پیشکش محض اس لیے کی تھی کہ وہ جانتے تھے سبط بغیر کام کیے کسی سے بھی کسی قسم کی مالی اعانت حاصل نہیں کریں گے۔ ان کی یہ فیکٹری ''ایمکو'' اس زمانے میں منٹ لاہور کے پاس تھی اور ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھی۔ سبط نے اس کے قیام میں بڑی محنت کی اور مزدوروں کے حقوق کے لیے اپنے اس دوست سے مسلسل دنگا فساد کرتے رہے۔ اس کے بعد کافی مدت تک انھوں نے فیروز سنز کے ساتھ کام کیا۔ یہ کام اگرچہ نسبتاً بہتر تھا مگر یہاں بھی وہ دوسروں کی مرضی کے تابع رہ کر کام کرنے کی وجہ سے خاصے پریشان رہے۔ پھر چند ماہ وہ ہمارے مشترکہ دوست نواب مظفر علی قزلباش کے بھتیجے اور ہونے والے داماد کے اتالیق رہے۔ یہ سب کام انھوں نے اپنی معاشی ضروریات کے لیے کیے یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے جہاں بھی اور جو کام بھی کیا اس میں بھرپور اور بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ہر کام محنت، نیک نیتی، اور دیانت داری سے کیا اور ہر جگہ سے خود ہی کام چھوڑ کر علیحدہ ہوئے۔ کہیں ان کا خیال تھا کہ وہ جتنا معاوضہ پا رہے ہیں، کرنے کا کام اس سے کم ہے۔ کہیں بور ہو کر تنگ آ کر علیحدہ ہوئے۔ یہ سارے کام وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے نہیں بلکہ محض پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کرتے رہے۔ مگر ذہنی طور پر پریشان رہے۔ اس پریشانی کا ذکر انھوں نے کبھی کسی دوست سے نہیں کیا۔ بظاہر خوش باش اور اپنے حال میں مست نظر آتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ لاہور میں جسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ ان پر معاشی مشکلات کا بوجھ اتنا بڑھا دیا گیا کہ بالآخر انھیں کراچی جانا پڑا۔

کراچی کا قیام

کراچی میں ان کے ابتدائی دو تین برس ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے محکمہ تعلقات کے سربراہ کی حیثیت سے، اس شعبے کو فعال اور موثر بنانے میں گزرے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہاں بھی انھوں نے متعدد کارنامے سرانجام دیے، تعلقاتِ عامہ کے کام کو ایک نئی جہت عطا کی اور نئے نئے اور موثر سلوگن ایجاد کیے۔ جب یہ کام سیٹ ہوگیا تو تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی اور زندگی کے آخری دس بارہ برس میں متعدد معرکۃ الآرا تصانیف مکمل کیں۔

سبط حسن کے کراچی چلے جانے کے بعد ہمارا ان کا دوستانہ رابطہ ویسا نہ رہا جیسا کہ برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے کام سے لاہور آتے تو ان کی آمد ہوا کے تازہ اور ٹھنڈے جھونکے کی مانند محسوس ہوتی۔ دوست احباب جمع ہوتے، محفلیں جمتیں اور سبط ہمیشہ اس شہر کو چھوڑنے پر افسردہ ہو جاتے۔ ان کا کہنا تھا وہ لاہور آنے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں اور یہاں آنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس زمانے میں، میں بھی کئی بار کراچی گیا اور جب تک وہ سوسائٹی میں رہائش پذیر رہے، ہمیشہ انہی کے ہاں ٹھہرا۔ اتفاق سے ساٹھ کے عشرے میں فیض صاحب بھی کراچی ہی میں تھے۔ چنانچہ ہم سب لوگ سر شام جمع ہو جاتے، مرحوم زیڈ اے بخاری، مرحوم مجید ملک اور بہت سے دوسرے احباب ان محفلوں میں علم و آگہی کے موتی بکھیرتے، شعر و نغمہ کی گفتگو ہوتی، ملکی حالات پر تبصرہ ہوتا اور سب سے زیادہ ذکر لاہور اور یہاں کے دوستوں کا رہتا۔ آخری پانچ برس کے دوران جب سبط گلشن اقبال میں اپنے مکان میں منتقل ہو گئے، ان کے ساتھ رہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس لیے کہ یہ گھر شہر سے کافی دور تھا۔ مگر اس زمانے میں بھی کراچی پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ان کے دفتر قمر ہاؤس جانا ہوتا۔ ہم نے کراچی جانے کا کوئی موقعہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا وہاں ابن انشاء اور سبط حسن سے ملیں گے۔ انشا جی بہت پہلے سدھار گئے۔ اب سبط بھی گئے۔ میرے لیے کراچی اب ویران شہر ہے۔ وہاں جا کر پرانی یادیں ستاتی ہیں اور زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ اتنے ساتھی، دوست، رفیق اور ہمدم چلے گئے ہیں کہ یہ دنیا اب سونی سونی نظر آتی ہے۔

آخری سال

گذشتہ برس یعنی 1985 میں سبط سے ملاقات کے نسبتاً زیادہ مواقع ملے۔ وہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہونے والی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں بہت سرگرم رہے، اس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور کراچی اور لندن میں ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں۔ پھر وہ کراچی کانفرنس کی تقریبات کے سلسلے میں دوبارہ لاہور آئے دوستوں کو جمع کیا اور نوجوانوں کو خاص طور سے آگے بڑھنے اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کی طرف متوجہ کیا۔ کراچی کانفرنس کے دوران میں کچھ نوجوانوں خاص طور سے سندھ اور بلوچستان سے آنے والے مندوبین نے جب اپنی تقریروں میں ہم سب پرانے لوگوں بالخصوص سبط حسن کو میانہ روی اور مصلحت کیشی کے طعنے دیے اور میں نے ان کا جواب دینے کا ارادہ کیا تو سبط نے مجھے منع کیا۔ اور کہا ''بھائی ان لوگوں کو دل کا

غبار نکال لینے دو، انھوں نے اس زمانے میں بہت اذیتیں برداشت کی ہیں۔ بہت مار کھائی ہے۔ اس لیے وہ جو کہتے ہیں کہنے دو۔"

کراچی کانفرنس میں بعض نوجوانوں نے سبط کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی۔ لیکن گذشتہ تین برس سے وہ ایک ہی بات کہتے تھے۔ "ہم سب کا کام سائنسی فکر اور ترقی پسندانہ خیالات کو فروغ دینا ہے۔ کیونکہ رجعت پسندوں اور بنیاد پرستوں کی کوشش اس ملک کو دو چار سو سال پیچھے لے جانے کی ہے۔ یہ لوگوں کو روٹی روزگار کے مسائل سے الگ کر کے خیالی جنتوں کے تصور سے بہلا رہے ہیں۔ یہ موجودہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں ہیں اور اس استحصالی نظام کے پشتی بان ہیں۔ ہر محبت وطن روشن خیال شخص کا فرض ہے کہ ان کا مقابلہ کرے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کو فکری اور ذہنی انقلاب کے لیے تیار کیا جائے۔ خود انھوں نے زندگی کے آخری چند برسوں میں یہی کام کیا۔ وہ نہ کسی تحریک کے سربراہ تھے اور نہ نام نمود کی خواہش رکھتے تھے۔ البتہ اس مشن کی تکمیل کے لیے جسے انھوں نے اوائل عمر میں اپنایا تھا، زندگی کی آخری سانس تک کام کرتے رہے۔

کراچی میں انھوں نے احباب کا ایک بہت وسیع حلقہ پیدا کر لیا تھا..... ایسا کیوں نہ ہوتا اس لیے کہ ان سے ملنے والے ان کی سحر انگیز شخصیت کے گرویدہ ہو جاتے۔ وہ ذہنی اور جسمانی ہر لحاظ سے سرتاپا جمال ہی جمال تھے۔ ان کی خوبصورت سوچ اور دلآویز شخصیت کا طلسم ایسا نہ تھا کہ ملنے والوں کو متاثر نہ کرتا۔ وہ انتہائی اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے" اردو فارسی کے کلاسیکل ادب پر انھیں پورا عبور حاصل تھا۔ وہ چاہتے تو دنیاوی مال و دولت کے ڈھیر لگا لیتے۔ لیکن ان کی زندگی درویشانہ تھی کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ کبھی اپنی افتادِ طبع کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اور مصلحت کیشی اور مفاد پرستی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ ان کے چاہنے والوں اور نیاز مندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آخری دو تین برس میں، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تنہائی اور گوشہ نشینی ترک کر رہے ہیں۔ جو نوجوان ان سے کچھ پوچھنے اور سمجھنے کے لیے آتے تھے ان سے وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ بہت مہذب، خلیق، نازک مزاج، نفاست پسند اور انتہائی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی رحلت نے ہم سے ہمارا بہت بڑا سرمایہ چھین لیا ہے۔ مگر اپنی تحریروں کی شکل میں جو سرمایہ وہ چھوڑ گئے ہیں وہ برسوں تک آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔